خطبۂ صدارت

اجلاس نہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ

۴ر و ۵ر مارچ ۱۹۸۹ء

بمقام کانپور

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

شائع کردہ

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ آفس لکھنؤ

۱۴۰۹ھ — ۱۹۸۹ء

کتابت ———— ظہیر احمد کاکوروی
طباعت ———— لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)
صفحات ———— ۳۸

باہتمام
محمد غیاث الدین ندوی

طابع
آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کیمپ آفس لکھنؤ

ناشر
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ
(ندوۃ العلماء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہٗ والصلاۃ والسلام علیٰ من لا نبیَّ بعدہٗ

حضرات!

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اُن کے ایمان و عقیدہ کا جزو ہے کہ اُن کا عائلی قانون (PERSONAL LAW) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد و عبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم و خبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے، اور اس کائنات کا بھی، اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:-

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَھُوَ	کیا وہی آگاہ نہ ہوگا؟ جس نے
اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ○	پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں
(سورۃ الملک ـ ١۴)	اور باخبر ہے۔

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی، حال، مستقبل کی

تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے۔

اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید ملّت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (LOGICAL CONTRADICTION) (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی وعملی نفاق (HYPOCRISY) کے سوا کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمّل، متوازن اور عادل ہونے اور زمان و مکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے بارہ میں عقلی وعملی شواہد، اور مسلم اور غیر مسلم، مشرقی و مغربی فضلاء، جری وانصاف پسند محقّقین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی "شپرّہ چشم" ہی ان سے انکار کر سکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے، اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

متعدد انصاف پسند مغربی فضلاء اور معاشرتی وتمدنی تاریخ کے ماہرین نے ان قرآنی اور شرعی تعلیمات کی برتری کا اعتراف کیا ہے، جو عورتوں کے احترام اور ان کے حقوق وتحفّظات پر مشتمل ہیں۔

ہم یہاں دو تین شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں سے ایک شہادت ایک مغربی فاضلہ کا ہے، جو ہندوستان میں ایک تربیتی و اصلاحی تحریک کی قائد،

اور جنوبی ہند کے ایک ثقافتی ادارہ (تھیاسوفیکل سوسائٹی) کی صدر رہی ہیں، انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، کسی خاتون کی شہادت اس لئے بھی اہم اور قیمتی ہوتی ہے کہ وہ عورت کے معاملہ میں حسّاس ہوتی اور اس کی طرف سے دفاع میں دلچسپی رکھتی ہے، مسز اینی بسنت (MRS. ANNIE BESANT) کہتی ہیں :۔

"..... ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانہ تک انگلینڈ میں اپنائے جا رہے تھے، یہ سب سے منصفانہ قانون تھا ــــ جو دنیا میں پایا جاتا تھا، جائیداد، وراثت کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا، اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا، یک زوجگی اور تعدّد ازواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلّت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اوّلین محافظ سڑکوں پر صرف اس لئے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے ان کا دل بھر جاتا ہے، اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔"[1]

مسٹر (N. J. COULSON) لکھتے ہیں :۔

" بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے معاملہ میں خاص طور پر شادی شدہ

---

[1] Annie Besant. *THE LIFE & TEACHINGS OF MUHAMMAD.* (Madras—1932), p. 3

عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں،
نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں، جن کا عمومی مقصد
عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے، اور وہ عربوں کے قوانین میں
انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں،..... اسے قانونی شخصیت عطا
کی گئی جو اسے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے
سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے، وہ عدّت کو اس میں شامل کرنا ہے"[1]

مذہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :-

"پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا
جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا، خصوصی طور پر عورت متوفی شوہر
کے ترکہ کا جانور نہیں رہی، بلکہ خود ترکہ پانے کی حقدار ہو گئی، اور
ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا
تھا، طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہو گیا کہ وہ اسے وہ
سب چیزیں دیدے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم اور شاعری سے دلچسپی
لینے لگیں، اور کچھ استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا، طبقۂ عوام کی
عورتیں اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اپنے خاوندوں کی خوشی اور

[1] N. J. Coulson, *ISLAMIC SURVEYS : A HISTORY OF ISLAMIC LAW*. (Edinburg—1971), p. 14

غم میں شریک ہونے لگیں، ماں کی عزت کی جانے لگی۔"[1]

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ انتشار و زوال کے آخری مرحلہ پر پہونچ گیا ہے، عائلی زندگی کی ابتری اور معاشرتی ربط و تعلق کی کمزوری، بے وقعتی اور مذہب و اخلاق سے اس کی آزادی اور آخری درجہ کی جنسی بے راہ روی نے پورے پورے ملک نہیں بلکہ مغربی تہذیب کو اس انجام کے قریب لا کر کھڑا کر دیا ہے، جو قدیم یونانی، رومی، ساسانی تہذیبوں کو پیش آیا اور تاریخ میں صرف اُن کا نام رہ گیا، اس انجام سے اس کو اس کی مادّی و صنعتی، علمی و تحقیقی ترقیاں جو نقطۂ عروج پر پہونچ گئی ہیں، اور جنگی اسلحہ و سیاسی طاقت، اور دنیا کے اقوام و ملل پر حاکمانہ و سرپرستانہ و ناصحانہ و محتسبانہ اثر و نفوذ بھی روک نہیں سکتا کہ جس گھر کا شیرازہ اندر سے درہم برہم ہو چکا ہو، اس کو نہ کوئی جنگی طاقت بچا سکتی ہے، نہ باہر کی مدد، بقول اقبال ؎

خود بخود گرنے کو ہے پکّے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو نہیں ٹوکتا، لیکن طلاق دینا معیوب ہے، اور اس میں ہزاروں دقّتیں ہیں،

---

[1] ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS, (New York, 1912), Vol. V, p. 271

یہ کہاں کا انصاف ہے؟

مغرب میں عائلی زندگی اور معاشرت کا جو بُحران (CRISIS) پایا جاتا ہے، اور اس کا اعصاب و اخلاق پر جو اثر ہے، اس کے لئے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے :-

"شہری خانہ بدوشوں کی ایک نسل ہے جو خاندان کے مرکز سے بہت دور جا چکی ہے، اور جو اپنے کام میں روحانی سکون کی مُتلاشی ہے، جس کے ذریعہ اُسے حرارت اور تقویت حاصل ہوتی ہے، لیکن (کام کا) نگراں اگر احمق ثابت ہوا، یا مشاہرہ ناکافی ہوا، یا ملازمت غیر محفوظ یا غیر منفعت بخش ہوئی تو اسے قلبی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی فریب میں مبتلا تھا، اس کے دل کو ایک گہری چوٹ لگتی ہے، یا شاید اس چوٹ سے اُسے انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے اندر تو پہلے سے ہی خلا موجود تھا، اور پھر اس انکشاف کے بعد وہ پستول کا سہارا لیتا ہے، یا پھانسی کے پھندہ کا، یا پھر نشہ آور گولیوں کا، اور صرف یہ نوٹ چھوڑ جاتا ہے کہ "خاک شدم"۔ [1]

---

[1] Lance Morrow: *THE BURNOUT OF ALMOST EVERYTHING IN THE TIME MAGAZINE*, Washington. Dated September. 27. 1981

ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے۔

حاضرین کرام! ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی و عائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے، اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں مذہبی آزادی اور ملّی تشخّص کے نہ صرف جواز و امکان کا اعتراف بلکہ احترام کیا ہے، اس خصوصیت کی نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ اس کی حفاظت و بقا اور ترقی کو بھی پسند کیا گیا ہے، اور اس کو ملک کی عزت و عظمت اور نیک نامی و شہرت کا ذریعہ سمجھا گیا ہے، اور اسی کے لئے نا مذہبی (SECULAR) اور جمہوری طرزِ حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانبداری اور ذہن و ضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) کو سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابلِ قبول نظام سمجھ کر قبول کیا گیا ہے، اور یہ حقیقت پسندی، سچی حُبّ الوطنی، اقوام و مِلَل، تمدّنوں، تہذیبوں اور علوم و فنون، اور فلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

اس حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کے مختلف فرقوں، آبادی کے مختلف النّوع عناصر اور اقلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب

وعقائد، اپنے تمدّنوں اور تہذیبوں، اور اپنے معاشرتی وعائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت و دفاع میں صرف کرنے کے بجائے، ملک کی تعمیر و ترقی، اس کی سالمیّت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزّت و مقام کے کام پر مرکوز رکھنے کے لئے دستورِ ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے، اور جس میں ہندوستانی شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس دستور کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں:-

"امن عامّہ، اخلاق اور صحت نیز اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور آزادانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ و اشاعت کا یکساں حق ہوگا۔"

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی، تمدّنی، تہذیبی و نفسیاتی صورتِ حال کے عین مطابق تھی، اور اس پر پوری دیانت داری، خلوص اور عزم و فیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی، لیکن اس قابلِ احترام دستورِ ہند کا جس میں ملک کے ماہرینِ قانون اور دستور سازوں کی بہترین ذہنی اور قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں جس نے بہت وقت لیا، اور جس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئی ہوں گی، عجیب و غریب تضاد اور دستورِ ہند کی تاریخ کا ایک معمّہ ہے کہ اسی دستور کے دفعہ ۴۴

کی شکل میں یکساں مدنی قانون کی دفعہ (UNIFORM CIVIL CODE) شامل کی گئی،
اور اس کو دستورِ ہند کے رہنما اصول کا درجہ دیا گیا، اس دستور کا متن حسبِ ذیل ہے:

"مملکت، ہندوستان کے پورے قلمرو میں شہریوں کے لئے یکساں مدنی
ضابطہ (UNIFORM CIVIL CODE) کے حصول کی سعی کریگی"۔

اس مسئلہ کے دو بڑے محرّک ہیں، ایک یہ کہ "سلطانی جمہور" کے اس دور میں قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے، اور "عائلی قانون" (PERSONAL LAW) زندگی کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط بھی رکھتا ہے، جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں "آسمانی قانون" کا کوئی تخیّل یا عقیدہ نہیں ہے، اور وہ عائلی قانون کو محض زندگی کے تجربات کا نتیجہ، اور خواہشات و ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں (اور بدقسمتی سے دو بڑے آسمانی مذہبوں اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی قوموں اور فرقوں بالخصوص آریائی نسلوں میں یہی تخیُّل پایا جاتا ہے) ان قوموں اور فرقوں میں اس قانون میں حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل قدرتی امر و بدیہی حقیقت ہے، اس لئے کہ وہ انسانوں ہی کے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں، زمانہ بدل جانے اور حالات تبدیل ہوجانے سے تمدّن و تہذیب، اور لباس و معاشرت کی طرح ان میں بھی اصلاح و ترمیم اور تبدیلی

نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات فرض وواجب ہو جاتی ہے۔

دوسرا بڑا محرّک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزاء میں زیادہ سے زیادہ ہم رنگی و وحدت کا وہ عالمگیر رُجحان ہے جس کا تقریباً اس صدی کے اوائل سے بڑی قوت و شدّت کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا گیا، اور اس میں ادب، شاعری، علم و سیاست، اور صحافت و خطابت سب نے پورا حصہ لیا ہے، یورپ سے (جہاں تقریباً ایک مذہب، ایک طریقۂ زندگی، ایک تہذیب، لیکن متعدد زبانیں رائج ہیں) یہ خیال ان مشرقی و ایشیائی ممالک میں آیا جہاں کئی کئی مذہب، مختلف تہذیبیں اور مختلف معاشرتی و عائلی نظام بھی پائے جاتے ہیں، لیکن یہ مذہب، تہذیبیں، اور مختلف معاشرتی نظام کبھی باہمی نفرت، زور آزمائی اور انتشار کا باعث نہیں ہوئے، انتشار و تضاد کا اصل سبب ہمیشہ سیاسی اغراض اور سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی مفادات اور اقتدار کی خواہش ثابت ہوا ہے، خود یورپ میں مکمّل مذہبی اور معاشرتی وحدت کے باوجود دو دو خوں آشام جنگیں ہو چکیں، جن کے شعلوں سے مشرق و ایشیا کا دامن بھی نہیں بچ سکا، پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً و ابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں، بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون و معاشرت تقریباً ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے، اور نبرد آزمائی اور

تصادم سے باز رکھ سکتا ہے، تو اس کو وہاں روکنا چاہیئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑ پڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔

دور کیوں جائیے آپ اپنے ملک بلکہ شہر کی عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آئیے کہ مسلمان مدّعی ہے اور مسلمان ہی مدّعا علیہ ہے، مسلمان مسلمان کی عزّت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے کہ اس میں بھی عائلی قانون (PERSONAL LAW) کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی، اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت، دولت پرستی کے جنون، حد سے بڑھی ہوئی مادیت، اور اس نظام و نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرّہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیئے تاکہ آپس میں اتّحاد و اُلفت پیدا ہو، طوطے کی طرح اس بات کو دُہراتے رہنا

سطحیت (SHALLOWNESS) مرعوبیت اور اندھی تقلید کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

اس موقعہ پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون ایڈن ہیمر (E. BODENHEIMER) نے فلسفۂ قانون اور اس کی سماجی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری آنکھ کھولنے اور حقیقت پسندی سے کام لینے کے لئے کافی ہے، وہ کہتا ہے:-

"کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو، لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، تو اس قانون کو ٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمّہ داروں کے لئے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے جسے وہ نامناسب یا ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظامِ قانون کو برقرار رکھنے پر مُصر ہو، اسے اس کو نافذ کرنے میں سخت مُشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لئے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پُر خطر ہوگا، جیسا کہ جان ڈکنسن نے کہا ہے:

"ہمیں کسی عام اور متعیّن ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی جس کی بنیاد انسانی ضرورت اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابلِ عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار اور اندرونی رجحانات

کی خلاف ورزی کرے گا، ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائیگی، اور وہ اتنا ناپائیدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہو جائیگا۔"[1]

پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یکسانی اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے اگر کوئی قانون کسی آبادی کے کسی عنصر، ملک کے کسی فرقہ اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، تو وہ اتحاد، باہمی تعاون، ملک کی تعمیر و ترقی میں گرم جوشی و خلوص اور سکون و مسرّت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے، مزید انتشار، بے دلی یا نیم دلی، بلکہ مجبوری اور غلامی کا وہ احساس پیدا کر سکتا ہے، جو کسی آزاد ملک یا متحدہ قومیت کے لئے جذام اور کوڑھ سے کم نہیں۔

حضرات! یہ دین جو ہم تک پہونچا ہے، اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (SOCIAL WORKERS) اور بانیانِ سلطنت کے ذریعہ نہیں پہونچا، یہ سارے گروہ قابلِ احترام ہیں، لیکن "دین" اور تہذیب، نظام فکر، مکتب خیال (SCHOOL OF THOUGHT) اور خالص مطالعہ، غور و فکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حدفاصل، سرحدی لکیر (LINE OF DEMARCATION) ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے

[1] E. Bodenheimer, *JURISPRUDENCE*, Harvard, 1967, p. 212.

جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حدِّ فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہونچے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (CONFUSION) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعتِ مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب و تمدّن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں۔

یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حدّ فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفۂ سماجیات (SOCIOLOGY) کا علم، تہذیب و تمدّن (CIVILIZATION) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ، یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب و تمدّن اور فکر و دانش کا ایک مستقل مدرسہ (SCHOOL OF THOUGHT) بھی ہے، لیکن اس کی

جو اصل حقیقت ہے، وہ یہ کہ وہ ایک "دین" ہے، اور اس کو دنیا میں پیش کرنے والے، اور اس کو بر روئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہیں، اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرزِ فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لئے اسی درجہ قابلِ احترام اور قابلِ اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لئے اور سارے امّتیوں کے لئے ہے:-

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰىۙ (سورۃ النجم ـ ۳-۴)	اور وہ خواہشِ نفس سے منھ سے بات نہیں نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اور ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)
مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَاؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍۙ (سورۃ الشوریٰ ـ ۵۲)	تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے نہ ایمان کو ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینہ میں اتارا، اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں، اور

بیشک (اے محمدؐ) تم سیدھا
راستہ دکھاتے ہو۔

علم و تجربہ، اور وحی و نبوّت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم فضلاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی و نبوّت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات ناآشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی ذہانت کا انکار ہے، اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی اور نفسیاتی تجزیہ یہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں، اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے، اور اس کے کیا اثرات مرتّب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارہ میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی و علمی حقیقت ہے کہ کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے، جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرماں بردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے دائمی بھی ہے،

عمومی بھی، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی، متعیّن بھی ہے اور جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا	اے ایمان والو! اسلام میں
فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا	پورے پورے داخل ہوجاؤ
خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ	اور شیطان کے پیچھے نہ چلو،
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (سورۃ البقرۃ ۲۰۸)	وہ تو تمھارا صریح دشمن ہے۔

اس لئے اگر مسلمان مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں۔

حضرات! فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے، کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں، (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں

مسلمان نہیں۔

اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت، نظامِ تمدّن اور عائلی قانون مسلّط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوتِ ارتداد کا کرنا چاہیئے، اور یہ ہمارا شہری، آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور، اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمّت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفّظ اور اظہارِ خیال کی آزادی، اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے۔

ملک آزاد ہونے کے بعد ہی تیز اور دور بیں نگاہ رکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ اُفق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگئی ہیں، یکساں سول کوڈ (UNIFORM CIVIL CODE) اور عائلی قوانین میں ترمیم کی صدائیں (کسی قدر خاموشی کے ساتھ) بلند ہونے لگی ہیں، اور انھوں نے محسوس کر لیا کہ یہ بادل جو ابھی کسی کسی وقت گرجتا ہے، کسی وقت ضرور برسے گا، تو انھوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رُخ کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہے، تاکہ اچانک ان پر

یہ یا کوئی دوسرا مسئلہ شب خون نہ مارنے پائے، یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا، جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتبِ خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رُخ معلوم ہو گیا، اور اتنا ثابت ہو گیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فیصد متفق ہیں، اس لئے دانش مندی، حقیقت پسندی اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

یہ صورت حال قائم تھی، اور مسلمان اقلیّت اور اس معاشرہ وماحول کے دریا کی سطح ساکن تھی کہ ۲۳؍ اپریل ۱۹۸۹ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں نفقۂ مُطلّقہ کے بارے میں وہ ہنگامہ خیز فیصلہ دیا، جس سے ملّت اسلامی، مسلم معاشرہ، علماء اور دانشوروں اور مسلم ماہرین قانون کے حلقہ میں ایک ایسا تلاطم اور طوفانی کیفیت پیدا ہوئی، جس کی نظیر اپنی وسعت وعمومیت، شدت احساس بلکہ اذیت وکرب کے لحاظ سے عظیم فرقہ وارانہ فسادات، خون ریزی وانسان سوزی کے لرزہ خیز واقعات کے معاملہ میں بھی نہیں ملتی، اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے تہذیبی،

معاشرتی ارتداد، شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○	احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے
(سورۃ المائدۃ - ۴۴)	تو یہی لوگ کافر ہیں۔

کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا، اور وہ حقیقتاً غیر مسلم جج صاحبان، یا قرآن وحدیث و تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور عربی زبان میں مہارتِ خصوصی نہ رکھنے والے مسلمان ججوں کے لئے قرآنی آیات، اس کے الفاظ و اصطلاحات کی دوسری زبانوں کے ترجمہ کی مدد، سکنڈ ہینڈ معلومات، سطحی اور عاجلانہ مطالعہ اور بعض اوقات "ترقی پسندی" یا بیرونی اثرات و مؤثرات سے تأثر کا نتیجہ تھا، اور اس سے مَن مانی تفسیر اور خواہشمندانہ (WISHFUL) تشریح کا دروازہ کھلتا تھا، یہ نہ صرف دین و شریعت، مذہبی صحیفوں، بلکہ دنیا کے دائمی عالمگیر اصول اختصاص (SPECIALISATION) اور علوم و فنون میں "اتھارٹی" کے تسلیم و احترام کے اس اصول کے خلاف تھا، جو ساری علمی، فنی دنیا میں صدیوں سے تسلیم کیا جا رہا ہے، اور جس پر زبان و ادب، فلسفہ، منطق، سائنس، ٹکنالوجی، اجتماعیات و مدنیات کا نظام چل رہا ہے۔

اس موقعہ پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری، اور ملّی غیرت و خودداری کا ایسا ثبوت دیا، جس کی نظیر عرصۂ دراز سے ملّی و دینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے جن میں بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسۂ عام میں جو ۷ اپریل ۱۹۸۶ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا، محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ (500.000) (نصف ملین) انسان تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے، اس کے علاوہ وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں، اس کے بالمقابل انگریزی و ہندی پریس نے اس مسئلہ پر ایسی مخالفانہ صف آرائی (CONFRONTATION) کا مظاہرہ کیا، جس کی مثال شاید تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی شدتِ احساس، اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش اور ایک جزوی عائلی مسئلہ

میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود طبقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مُطلّقہ خواتین) متأثر ہوتی تھی — کو اس نظر سے دیکھا گیا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے، یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی مہلک وبا پھیلنے والی ہے، جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ اور پریس کانفرنس میں کہا تھا، انھوں نے اس بارے میں اصول "احساس تناسب" (SENSE OF PROPORTION) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں کے ساتھ (جس میں نظم و احترام قانون اور سنجیدگی، وقار کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے) بورڈ کے ذمّہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ و ہدایت سے جمہوریۂ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا، انھوں نے راجیو جی سے دو تین مرتبہ شخصی اور خصوصی ملاقاتیں کیں، اور آزادانہ و بے تکلفانہ فضا میں ان کو اس مسئلہ کی نوعیت و اہمیت مذہبی و شرعی نقطۂ نظر اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات و تأثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی، راجیو جی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب و بے چینی اور عظیم الشان جلسوں کی

رپورٹ پہونچ چکی ہوگی) صبر و سکون اور احترام کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور وہ اس بارے میں مطمئن ہوگئے، کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے، اور اس کی صحیح ترجمانی وہی علماء کرسکتے ہیں، جن کا دین کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے، اور وہ مسلمانوں کے نزدیک دین و شریعت کے معتبر ترجمان ہیں، اور اس سے وہ کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے، چنانچہ انھوں نے ایک سے زائد بار اس کا اظہار کیا کہ انھوں نے اس مسئلہ پر نامور علماء سے تبادلۂ خیال کرلیا ہے، اور وہ مطمئن ہیں کہ اسلام طبقۂ اناث (FAIR SEX) بشمول مُطلّقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفّظ کرتا ہے، اس سلسلہ میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں، کہ "وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ ان کے حقوق کا تحفّظ کرتا ہے، اور ان کو حق دیتا ہے"، وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جُرأت اور احساس ذمّہ داری اور عزم و فیصلہ کے ساتھ مطلّقہ خواتین کے حقوق کے تحفّظ کا بِل پارلیمنٹ میں لائے، اور اس پر واضح اور طاقتور وھپ (WHIP) جاری کیا۔

اس بِل کے پارلیمنٹ میں پیش کئے جانے سے پہلے بورڈ کے ذمہ داروں اور قانون داں ممبروں نے اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، ان کو اس میں متعدد خامیاں، اور اصلاح طلب نقاط نظر آئے، چند ممتاز قانون داں شرکائے کار نے احتیاط کے ساتھ اور ضروری حد تک ایک مختصر فہرست

ترمیمات واصلاحات کی مرتب کی اور صدر بورڈ نے اپنے ہاتھوں سے براہ راست وزیر اعظم صاحب کو بل کے پارلیمنٹ میں آنے سے پہلے پیش کی اور ان سے درخواست کی کہ بل کے پیش کرنے سے پہلے وہ ان کی روشنی میں بل کو اس مکمل اور صحیح شکل میں پیش کرنے کی تکلیف گوارا کریں، جس سے وہ اس مقصد کی پورے طور پر تکمیل کرے جس کے لئے یہ ساری جدوجہد کی گئی ہے، انھوں نے اس کا وعدہ کیا، لیکن اس تھوڑے وقت میں وہ اس کی تکمیل نہ کرسکے، انھوں نے اس کو اس کی موجودہ شکل میں ایک بار منظور ہو جانے کو بڑی کامیابی تصور کیا، اور وعدہ کیا کہ وہ یہ خامیاں دوسرے موقعہ پر دور کردیں گے، اور ۶ مئی ۱۹۸۶ء کو "تحفظ حقوق مسلم مطلّقہ" بل کے عنوان سے کھلی اکثریت کے ساتھ پاس ہوا، اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح (جو تائید و مخالفت اور خلوص و سیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی) اس شریفانہ اور جرأت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی اور جذبۂ شرافت کے ساتھ اعتراف، اور اپنے تشکر و امتنان کا اظہار کیا۔

محترم سامعین! درمیان میں قبل اس کے کہ بل پر پارلیمنٹ میں بحث ہو ایک اور نازک مرحلہ پیش آگیا، بل کے پیش ہو جانے کے بعد مخالفین نے ایک قانونی نکتہ اٹھایا، اور جسٹس آئر نے صاف کہا کہ اس بل کو

سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائیگا، اور چونکہ یہ بِل دستور کی دفعہ ۱۴ اور ۱۵ کے خلاف ہے، اور دستور میں دی گئی ذاتی آزادی (قانون کی نظر میں یکساں حقوق اور مذہب و صنف کی بنا پر عدم امتیاز) سے ٹکراتا ہے، اور ہندوستان کے باشندوں میں ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے، اس لئے سپریم کورٹ بہر حال اس بل کو مسترد کردے گا کہ ایسی قانون سازی جو دستور ہند کی دفعات کے خلاف ہو اسے مسترد کرنا سپریم کورٹ کی ذمہ داری ہے، ان حالات میں بِل میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی "بد نصیب" مُطلّقہ اس بِل سے مطمئن نہ ہو، اسلامی قانون کے تحت نفقہ حاصل کرنا نہ چاہتی ہو، بلکہ وہ دفعہ ۱۲۵ ہی کے ذریعہ نفقہ حاصل کرنا اپنے لئے صحیح سمجھتی ہو تو ایسی درخواست دے سکتی ہے اور پھر مجسٹریٹ دفعہ ۱۲۵ ہی کے تحت اس کا فیصلہ کرے گا۔

ترمیم میں یہ کہا گیا کہ صرف مُطلّقہ کا درخواست دینا اور دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ فیصلہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرنا قطعاً کافی نہ ہوگا، بلکہ مُطلّقہ اور اس کے سابق شوہر دونوں کی رضامندی ضروری ہوگی، اور دونوں کی مشترکہ درخواست کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا، جس کی توثیق حلف نامہ کے ذریعہ کی گئی ہو، اور اگر تنہا مُطلّقہ نے درخواست کی تو پھر اس کا فیصلہ بِل کے ہی مطابق ہوگا، دفعہ ۱۲۵ کے مطابق نہیں، دوسری شرط یہ لگائی گئی کہ

یہ درخواست اور رضامندی مقدمہ کی سماعت کے پہلے ہی دن ہونی چاہئے ورنہ قابل قبول نہ ہوگی ۔

یہ گفتگو ۱۹ اپریل ۱۹۸۶ء کو ہوئی، ہم لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ کسی ہوشیار اور باریک بین مخالف قانون داں نے وزیر قانون یا راجیو جی کے کسی اہم مُشیر کار کو سمجھایا ہے، اب اگر ہم اس کو مسترد کر دیتے ہیں، تو پھر جہاں سے چلے تھے وہیں آجائیں گے، اور عنقریب پیش ہونے والا بِل تعویق میں پڑجائیگا، یا تعطّل کا شکار ہو جائیگا، راجیو جی کے قریب ترین مُشیر کار نے اس کا بھی اشارہ کیا کہ اگر آپ نے یہ اضافہ مان لیا تو گورنمنٹ خود بِل کی حفاظت اور اس کے لئے قانونی چارہ جوئی کرے گی، ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس اضافہ میں دو شرطیں لگا کر دفعہ ۱۲۵ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں، اور عملاً اس کو بیکار کر دیا گیا، دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ شوہر کو تا نکاح ثانی یا حینِ حیات نفقہ دینا پڑتا ہے، کوئی نادان شوہر ہی ہوگا، جو دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ نفقہ کا فیصلہ کرانا چاہے گا، اور مُطلّقہ کی دی ہوئی درخواست پر اپنی رضامندی ظاہر کرے گا، اور اس پر دستخط ثبت کرے گا، اور کوئی ناخدا ترس اور ناسمجھ مُطلّقہ ہی ایسی ہوگی جو اسلامی قانون کو چھوڑ کر جس میں اسے ہر مرحلہ میں نفقہ کی ضمانت ہے، ایسے غیر شرعی قانون کو ترجیح دے گی، جس میں اس کے نفقہ کا

انحصار شوہر کی خوشحالی اور زندگی پر ہے، اگر شوہر مفلس ہے، یا اس کا انتقال ہو جائے تو پھر مطلّقہ کے لئے پریشانی اور حیرانی کے سوا کچھ نہیں۔

برادرانِ ملّت!

اب میں اس مجمع کو ایمانی و قرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں، اور آپ کے عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے، آپ اسلامی اور قرآنی قانونِ معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم و رواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں، اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا، اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی، مکہ، مدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے، قرآن مجید کے راستہ سے آئی ہے، یہ لعنت کہاں سے آئی ہے؟

جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرتِ ملّی کو، آپ کے وجودِ ملّی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میں ببانگِ دُہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو شکایت کرتے ہیں وہ شکایت بجا ہے، ہم شکایت کرتے رہیں گے، شکایت کرنا ہمارا حق ہے۔

ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا

حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو، اور شہریوں کی ہر تنظیم کو، اور آبادی کے ہر عُنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو اُس کے بغیر نہیں چل سکتا۔

حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے ایوانِ قانون ساز میں ایک حزبِ مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تاکہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی خامیاں معلوم ہوتی رہیں، اور اس کو ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقعہ ملتا رہے، اسی لئے ہم اپنی حکومت سے شکایت کرتے رہیں گے اور سَو بار کریں گے، اور اس کو اس پر فخر کرنا چاہیئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے، یہ حق سلب نہیں کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اس میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے، جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لئے ہمارے ملک کا یہ افتخار ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہنی چاہیئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکانِ حکومت سے، انتظامیہ اور حکمراں جماعت سے

شکایت کریں گے۔

لیکن جب ہم اپنی حکومت اور برادرانِ وطن سے شکایت کرتے ہیں، تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ اُن سے تو شکایت کریں گے، اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑ لیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا، جو آپ کا گریبان پکڑے گا، اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمھاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حُرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمھارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے، یہ کیا بُوالعجبی ہے؟

یہاں سے یہ عہد کرکے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، اُن کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ ۱۲ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی

دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے[1]، کیا اس کائنات کے خالق اور نوعِ انسانی کے مربّی (جس کی مخلوق مرد و عورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ "رحمۃٌ للعالمین" کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمّت نہیں ہونی چاہیئے تھی، میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ	اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک
وَأَنْتَ فِيهِمْ ط وَمَا كَانَ	تم ان میں تھے انھیں عذاب
اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ	دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ
يَسْتَغْفِرُونَ ○	بخشش مانگیں اور انھیں
(سورۃ الانفال ـ ۳۳)	عذاب دے۔

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہیئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہیئے، اور بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہیئے جو شریعت میں بیان کی گئی ہے، طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہیئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے؟ پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے،

[1] بحوالہ "قومی آواز" دہلی ۱۰ / جون ۱۹۸۲ء

اس کو سمجھنا چاہیئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن و مغلّظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق اَبغضُ المباحات ہے، خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: کہ جائز ہے، لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتّھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں، اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں، اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں لیکن یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے۔

حضرات!

اس موقعہ پر بورڈ کے بعض نئے اقدامات اور کارگزاری کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، امارت شرعیہ، بہار و اڑیسہ اور اس کے واجب الاحترام امیر کی ذاتی نگرانی میں مستند علماء اور ماہرین فقہ کے ذریعہ جدید زبان و اُسلوب و ترتیب کے ساتھ عائلی قانون اور مسائل نکاح و طلاق، وحقوق و فرائض کی تدوین کا کام جو چند مہینے پہلے شروع کیا گیا تھا، مرتب ہو کر ممتاز و صاحبِ فن علماء کی نظر سے گزر کر مکمل ہو گیا ہے، اس کی ترتیب کے بعد عدالتوں اور مجلس

قانون ساز اور معترضین کو یہ کہنے کا حق نہیں رہا، کہ ہمارے پاس قدیم تراجم کے علاوہ جو زیادہ تر غیر مسلم قانون دانوں اور مصنفین کی مرتب کی ہوئی ہیں، شریعت اسلامی کا مستند و براہ راست مجموعۂ قوانین نہیں ہے۔

۲۔ اس کے ساتھ اصلاحِ معاشرت، اصلاحِ رسوم اور مسلمانوں کی عائلی زندگی کو شرعی احکام، قرآنی تعلیمات اور اُسوۂ نبوی کی روشنی میں منظّم و بہتر بنانے کی کوشش بھی جاری ہے، اور جا بجا دار القضاء بھی قائم کیے جارہے ہیں، تاکہ مسلمان اپنے تنازعات اور مسائل خاص شریعت کی روشنی میں حل کریں، اور امکانی حد تک مقدمات و اختلافات کا فیصلہ کرانے میں (خصوصیت کے ساتھ جن کا تعلق احکام شرعی سے ہے) خود کفیل ہوجائیں۔

۳۔ بورڈ کے ذمہ داروں نے بعد میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں جن کا سو فیصدی صحیح اندازہ پہلے سے کرنا مشکل تھا، اس بل کی افادیت کو عملاً ثابت کرنے اور اس سے قانونی طور پر فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لئے دو کام ضروری سمجھے، ایک یہ کہ بل پر از سر نو ماہرین فقہ اور ممتاز قانون داں (جن کی خوش قسمتی سے خود ارکان بورڈ میں اطمینان بخش نمائندگی ہے) غور، تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کے بعد اس کو ایسی ترمیم شدہ شکل میں جو اس مثبت اور تعمیری انداز میں ہو جس سے

بل کی بنیادی ضرورت اور افادیت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تاریخی بلکہ تاریخ ساز جدوجہد لاحاصل اور "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے مصداق نہ معلوم ہو، اصلاح شدہ بل کو مؤثر اور موقر نمائندگی کے ذریعہ وزیر اعظم کو پیش کیا جائے، اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اس ترمیم شدہ مکمل بل کو (جو اپنے قدیم دائرہ ہی کے اندر رہے) پارلیمنٹ میں پیش کر کے دوبارہ منظور کرائیں، یا وہ طریقہ اختیار کریں، جس سے یہ بل موجودہ شکل میں نافذ العمل ہو، اس طرح وہ اُس جمہوری تقاضہ اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت اور فرقہ کے ایک جائز مطالبہ کو (جو خالص مذہبی بنیاد پر ہے) منظور کرا کے حقیقت پسندی، جمہوری روح اور ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کو جو ہندوستان سے باہر بھی دنیا کے وسیع ترین رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے، مطمئن اور شکر گزار ہونے کا موقعہ دیں گے، اور یہ بات صرف مسلمانوں ہی کے نہیں، ملک کے مفاد میں ہوگی، بورڈ اس سلسلہ میں جلد عملی اقدامات کرے گا، اور اس کا نتیجہ ملک کے سامنے آئیگا۔

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ وزارت قانون یا سپریم کورٹ کے ذریعہ عدالتوں کو یہ اطلاع دے دی جائے، کہ مسلم مُطلّقہ کے معاملہ میں اب زندہ، فعّال اور نافذ العمل دفعہ "مسلم مُطلّقہ کے حقوق کے تحفظ کا

(ترمیم شدہ شکل میں) یہ نیا بِل ہے، جو ۶؍مئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ نے پاس کیا، اس لئے کہ یہ دیکھا جارہا ہے کہ عدالتیں اس بِل سے تجاہلِ عارفانہ برتتی ہیں، یا اس کو نظرانداز کرکے دفعہ ۱۲۵ ہی کے مطابق فیصلہ کررہی ہیں، جیسا کہ گجرات اور کیرالا وغیرہ کے ہائی کورٹ کے فیصلہ سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے اس حقیقت کا بھی اظہار ہوا ہے، کہ خود وہ وکلاء اور ایڈوکیٹ جو طلاق دینے والے فریق (مرد) کی طرف سے بحث کرتے ہیں، وہ یا تو اس بِل سے سرے سے ناواقف ہیں، یا وہ اس کو نافذ العمل ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرنے اور کامیاب بحث کرنے میں پہلوتہی کرتے ہیں، اور اس کی صحیح وکالت نہیں کرتے، اس لئے ملک کے قانون داں طبقہ کو بھی (خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں) صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کو صحیح صورت حال سے واقف کرنا ضروری ہے، اور بورڈ کو اس سلسلہ میں علمی اور قانونی طور سے اس طبقہ کو (اگر رہنمائی کا لفظ اس کے شایان شان نہیں) مواد مہیا کرنے اور (FEED) کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ تجاہل اور تغافل کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہیگا، اور یہ پاس شدہ بِل اوراق کی زینت بن کر رہ جائیگا، امید ہے کہ بورڈ اس سلسلہ میں بھی جلد اقدام کرے گا۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کا نیز آپ کی توجہ و التفات کا

شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے لیے لوث اور آزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا۔

ہمیں خوشی ہے کہ یہ اجلاس ایک ایسے تاریخی شہر میں ہو رہا ہے، جس نے ملّی مسائل، دینی تعلیم، تحریکِ خلافت و آزادی میں شایانِ شان حصہ لیا، جہاں سے سب سے پہلے تحریک ندوۃ العلماء کا آغاز ہوا، اور اس کے ابتدائی جلسے اور مشاورتی مجالس ہوئیں، جن میں اس عہد کے ممتاز و سربرآوردہ علماء شریک ہوئے، جس سے ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی اور ایک تعلیمی تجربہ گاہ دارالعلوم کا منصوبہ تیار ہوا، جس کے لئے حکمتِ الٰہی نے اسی شہر کے ایک پڑوسی شہر لکھنؤ کا انتخاب کیا، یہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی و مفکر حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے والد نامدار، شیخ وقت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء کا بڑا وقت گزرا، اور یہیں ندوہ کا تخیّل ان کے ذہن میں آیا، یہیں مچھلی بازار کی مسجد پر انگریزی حکومت کے ایک ناروا اقدام پر سارے ہندوستان میں ناراضگی، حفاظتِ مساجد اور حمیّتِ دینی کی لہر دوڑ گئی، جس کی مؤثّر و ولولہ انگیز ترجمانی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پُرزور قلم سے "الہلال" میں کی، اور اس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تلاطم خیز مضمون "مشہدِ اکبر" نکلا، یہ تاریخی یادیں اور یہ قابلِ فخر خصوصیات

اس شہر کے لئے، اس اہم اجلاس وسیمنار کے انعقاد کے لئے نہ صرف جواز بلکہ استحقاق پیش کرتی ہیں۔

ابوالحسن علی ندوی

۱۲؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

۱۹؍فروری ۱۹۸۹ء